اقبال اور بہار کی نظر میں شیوہ شعر و شاعری

تسکین کوثر

ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج خوازہ خیلہ، سوات

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

سابق صدر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر مظہر عباس

اسسٹنٹ پروفیسر، دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

Abstract

Despite the tact that every poet has a distinctive uniqueness of expression that is manifested through the medium of poetry, yet we find undeniable similitude in the poetry of many poets. In the same way, we see vivid similarities and correspondence while analyzing the immortal poetry of the poets, Iqbal and Bahar. The complete harmony of thought and creativity that we find in the poetry of Iqbal and Bahar creates a thought provoking, artistic masterpiece that is not only comprehensive but also embellished with an everlasting charm. With the union of tradition and modernity, they have created an illustrious art piece in the form of a stanza or line that leaves an impact on our hearts and minds. Other striking similarity is the way phonics as well as the combination of analogical and dramatic aspects are tied so profoundly together.

شعر کیا ہے؟

دنیائے شعر و ادب میں شاعری کی تعریف میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست کے تحت ہمیشہ سے یہ جاننے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ شعر کیا ہے؟ اس سوال کا جواب پانے کے لیے یا یوں کہیں کہ شعر کی درست تعریف تک رسائی کے لیے ہم اجمالاً شعر و ادب کی دنیا کے ان نابغہ روزگار شعراء اور ادیبوں کی آراء کا جائزہ لیں گے جو استاد کا درجہ رکھتے تھے۔

ا۔ ولیم ورڈزورتھ (William Words Worth) کے مطابق "شاعری دل کی آواز اور جذبات کے بے ساختہ اظہار کا نام ہے۔"(۱)

۲۔ میتھیو آرنلڈ(Matthew Arnold)کے خیال میں "شاعری تنقید حیات ہے۔"(۲)

۳۔ آئی۔اے۔رچرڈس(I.A. Richards)کا کہنا ہے کہ "شاعری زندگی کے لیے ضروری ہے کیونکہ سائنس ہمیں وہ چیز نہیں دے سکتی جو شاعری دیتی ہے۔"(۳)

۴۔ ٹی۔ایس۔ایلیٹ(T.S.Eliot)کے نزدیک "شاعری عام جذبات کی تجسیم کا نام ہے۔"(۴)

۵۔ گوئٹے(Goethe)کی فکر میں "شاعری نوع انسان کی مادری زبان ہے۔"(۵)

۶۔ ارسطو(Aristotle)کی نظر میں "فن شاعری کا تعلق فطرت سے ہے۔"(۶)

۷۔ افلاطون(Plato)کے بقول "شاعر ایک روشنی ہے اور پرواز کرنے والی پاک چیز ہے۔ وہ اس وقت تک تخلیق نہیں کرتا جب تک الہامی قوت اس پر غالب نہ آجائے۔"(۷)

گویا افلاطون کے خیال میں شاعری ایک الہامی خیال ہے۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق زمین شعراء نے شاعری کی کیا تعریف کی ہے؟

۱۔ "ابن رشیق کے مطابق "شعر ایسا کلام ہے جو موزوں اور مقفٰی ہو اور بالارادہ لکھا گیا ہو۔"

۲۔ قاضی عبدالعزیز جرجانی کی نظر میں "شعر ایسا فن ہے جس میں طبیعت(جذبات)روایت (نقالی)اور زکاوت(تخیل)کو دخل ہوتا ہے۔"

۳۔ غلام علی آزاد بلگرامی کے خیال میں "شعر ایسا موزوں کلام ہے جو مقفٰی ہو اور قصداً لکھا گیا ہو۔"

۴۔ شبلی نعمانی کے نزدیک "جو جذبات الفاظ کے ذریعے ادا ہوں شعر ہیں۔"

۵۔ شمس الرحمان فاروقی کے مطابق "کلام موزوں شعر ہے۔"

۶۔ مجنوں گورکھپوری کے نزدیک "شاعری موزوں اور پرترنم الفاظ میں دلی جذبات کا اظہار ہے۔"(۸)

اب تک بیان کی جانے والی شاعری کی شعریف سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فنِ شعر کا تعلق جذبہ و احساس کے ساتھ ہے۔یہ ایسی فطری صلاحیت ہے جو کسبی سے زیادہ وہبی ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال و بہار کی نظر میں شعر کیا ہے؟ نیز ان کا فنِ شعر کہاں تک اس تعریف پر پورا اترتا ہے۔

اقبال کی نظر میں شیوہ شعر و شاعری:

اقبال کا شمار دنیا کے عظیم المرتبت شعراء کی صف میں ہوتا ہے اس کی ایک وجہ ان کی فکری و فنی ہم آہنگی بھی ہے۔اپنی بیاض میں ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ:

"فطرت قطعی فیصلہ نہ کر سکی کہ افلاطون کو شاعر بنائے یا فلسفی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے کے بارے میں بھی وہ اسی قسم کے تذبذب میں مبتلا رہی ہوگی۔"(۹)

اور بعینہ یہ بات خود اقبال پر بھی صادق آتی ہے۔بلکہ مذکورہ بیان کا انداز بتاتا ہے کہ خود اقبال کو بھی اس بات کا احساس تھا۔جیسا کہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے(۱۰)

بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کا شمار دنیا کے ان بلند پایہ شعراء میں ہوتا ہے جن کا کلام فلسفہ و شعر کے حسین امتزاج کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اقبال کو اپنی شاعرانہ حیثیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے فن کے ناقدین اور معاصر سخن پردازوں کی نکتہ چینی کے جواب میں یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

حسن انداز بیاں از من مجو
خوانسار و اصفہان از من مجو(۱۱)

ترجمہ: میرے اشعار میں انداز بیان کی خوبیاں مت تلاش کرو نہ خوانسار و اصفہان کی زبان تلاش کرو۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سونے قطار می کشم ناقہ بے زمام(۱۲)

ترجمہ: نغمہ کہاں اور میں کہاں یہ ساز سخن تو ایک بہانہ ہے جس کے ذریعے میں بھٹکے ہوؤں کی راہنمائی کرتا ہوں۔

اقبال نے ہمیشہ خود کو ایک شاعر محض کہلانے سے احتراز کیا ہے۔ ایک مقام پر اپنی شاعرانہ حیثیت کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہاں بعض مقاصد خاص ہوں کہ جن کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رُو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔"(۱۳)

اسی باب میں ان کا کہا ہوا درج ذیل بیان بھی اہمیت کا حامل ہے:

"شعر محاورہ اور بندش کی درستی اور چستی ہی کا نام نہیں، میرا ادبی نصب العین نقاد کے ادبی نصب العین سے مختلف ہے۔ میرے کلام میں شعریت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور میری ہرگز خواہش نہیں کہ اس زمانے کے شعراء میں میرا شمار ہو۔"(۱۴)

اقبال نے خود کو "شاعر فردا" قرار دیا ہے۔ اس کی بدیہی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس زمانے کی شاعری محض لفظی صنعت گری، زبان دانی کا اظہار اور کہنہ مضامین کی تکرار تھی۔ ایسی روایتی شاعری جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے فرسودہ جاگیر دارانہ نظام اور حاکمانہ ماحول کی پروردہ تھی۔ اور زمانہ حال کے تقاضوں سے قطعاً مطابقت نہ رکھتی تھی۔ ایسے ماحول میں اقبال نے شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی اور اسے مقصد کے ابلاغ کا ایک مؤثر ذریعہ قرار دیا۔ بنابرایں اقبال نے اپنی شاعری کو آنے والے دور کی آواز قرار دیا ہے اور یہ ان کی روشن ضمیری کی واضح مثال ہے جس کی بنا پر وہ آنے والے دور میں اپنی شاعری کی مقبولیت اور دوام کو ملاحظہ کر رہے تھے۔

نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم
من نوائے شاعر فردا ستم(۱۵)

ترجمہ: میں ساز سے بے نیاز نغمہ ہوں اور مستقبل کے شاعر کی صدا ہوں۔

شاعری کو مقصد کے ابلاغ و اظہار کا ذریعہ بنانے کے باوجود اقبال کی شاعری مقصدیت کے عنصر سے بوجھل نہیں ہے اور نہ ہی ان کے ہاں شعریت کا عنصر دب سکا ہے بلکہ اس کے برعکس ان کی شاعری شعری محاسن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہیت اور معنی دونوں لحاظ سے ان کی شاعری بے مثال ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی شاعری اردو و فارسی کے عظیم المرتبت شعراء کی شاعری کی ہم پلہ اور ہم پایہ ہے۔ اور باوجود یکہ انھوں نے اپنی شاعرانہ حیثیت کو درخور اعتنا نہیں گردانا۔ ان کی شاعرانہ حیثیت مسلمہ ہے۔ اقبال کا یہ کہنا کہ:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون مے خانہ (۱۶)

ان کے شعر کے فنی محاسن کی تردید نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بلکہ اس سے وہ لفظ پر معانی کی برتری واضح کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں اقبال کے پیر معنوی رومیؔ نے بھی لفظ پر معانی کی برتری کو اہمیت دی ہے اور اسے شعر کی قدر و قیمت کا معیار قرار دیا ہے۔

شعر می گویم بہ از آب حیات
من نہ دانم فاعلاتن فاعلات(۱۷)

ترجمہ: میں ایسے شعر کہتا ہوں جو قدر و قیمت میں آب حیات سے بھی بہتر ہیں۔ میں علم عروض و صنائع شعری کو نہیں جانتا۔

گویا لفظ پر معنی کی فضیلت کا رجحان اردو و فارسی شاعری میں شروع سے ہی چلا آ رہا ہے۔ یہاں تک کہ اساتذہ کی شاعری پر اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ فلاں کا شعر معانی سے تہی ہے یا محض لفظی صنعت گری ہے۔ نابغہ روزگار غالب کو بھی اس اعتراض کے جواب میں کہنا پڑا تھا کہ:

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معانی نہ سہی(۱۸)

یہاں جس شاعرانہ بے نیازی کا اظہار غالب نے کیا ہے اصلاً یہی بے نیازی اقبال کے مذکورہ اشعار میں نہاں ہے۔ انھوں نے شاعرانہ فروتنی کا اظہار کرتے ہوئے جہاں جہاں اپنی شاعرانہ حیثیت سے اغماض برتا ہے۔ درحقیقت وہ ان کی یہی صلے و ستایش سے بے نیاز فکر کا اظہار ہے۔ اسے ہم ان کے کمالِ ہنر کا اخفا بھی قرار دے سکتے ہیں۔ بقول فرمان فتح پوری:

> "اقبال نے اپنی شاعری کے بارے میں اس طرح کی باتیں از راہ انکسار یا بطور طنز کہی ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اقبال فی الواقع زبان و بیان کے نکات سے بے خبر تھے یا یہ کہ انھوں نے الفاظ و تراکیب کے استعمال میں تساہل برتا ہے۔ اور مقصدیت کو اولیت دے کر اپنے فن کو مجروح کیا ہے۔ درست نہ ہو گا۔ اقبال جیسا قادر الکلام اور رموز فن سے آگاہ شاعر کسی زبان میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔"(۱۹)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں اقبال نے اپنے فن کو مقصد کے ابلاغ کا ایک مؤثر ذریعہ بنایا ہے اور اس ذریعہ اظہار سے ملت اسلامیہ کو ایک حیات افروز پیام اور بلند نصب العین عطا کیا ہے۔ وہیں حرف و صوت اور نغمہ و تخیل کا دلآویز اسلوب بھی اختیار کیا ہے۔ فکر و فن کا یہ جادو اثر

اظہار فارسی و اردو دونوں زبانوں میں یکساں نظر آتا ہے۔

جب اقبال نے اپنے شعری شعور کو دریافت کیا تو اس کی مہمیز کے لیے ان کے سامنے مشرق و مغرب کے عظیم المرتبت شعراء کا فکری و فنی سرمایہ موجود تھا۔ جس سے انھوں نے خاطر خواہ استعفادہ کیا۔ خصوصاً ان کی شاعری کے ابتدائی دور کی غزلوں اور نظموں کا رنگ کسی قدر، قدما، متوسطین اور جدید شعراء کے رنگ سے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔ انہی کا سا اسلوب ان کے ہاں ملتا ہے لیکن زیادہ دیر نہیں گزری کہ ان کی جدت طبع اس مقلدانہ رنگ سے اکتا گئی اور ان کی طبع رسا نے اپنا جدا اور منفرد اسلوب اختیار کر لیا جو قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہے۔

اقبال کے فنی اسلوب کا مطالعہ کئی ایک پہلوؤں سے خاصا دلچسپ ہے۔ جن میں سے ایک ان کی شاعری کی صوتی ہم آہنگی بھی ہے۔ صوتیاتی آہنگ کا تعلق کسی حد تک شاعر کی افتاد طبع اور اس کے شعری مزاج سے ہوتا ہے لیکن اس کی تشکیل میں شعوری عمل دخل کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اقبال کی اعلیٰ فکر ایک ایسے معنیاتی اور صوتی آہنگ کی مقتضی ہے۔ جس میں باطنی ارتباط بھی بدرجہ اتم موجود ہو۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:

> "اقبال کے بارے میں یہ بات عام طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ ان کی آواز میں ایک ایسا جادو، ایسی کشش اور نغمگی ہے جو پوری اردو شاعری میں کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کے لہجے میں ایسا شکوہ، دانائی، بے پایانی اور گونج کی ایسی کیفیت ہے جیسے کوئی چیز گنبد افلاک میں ابھرتی اور پھیلتی ہوئی چلی جائے۔ اس میں دل نشینی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی برش، روانی، تندی اور چستی ہے جیسے سرود کے کسے ہوئے تاروں سے کوئی نغمہ پھوٹ بہا ہو یا کوئی پہاڑی چشمہ ابل رہا ہو۔"(۲۰)

اسی طرح مناسبت الفاظ بھی اقبال کے ہاں تسلسل سے موجود ہے۔ یعنی ان کے کلام میں الفاظ گذشتہ سے پیوستہ چلے آتے ہیں۔ الفاظ کا دروبست موضوع سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ تلازمات اور رعایت لفظی انتہائی مناسبت سے استعمال ہوتی ہیں۔ بقول شمس الرحمان فاروقی:

> "اقبال کے لفظی تناسبات، ان کے دروبست کا نظام، رعایتیں اور مناسبتیں ان کی نظموں کو اردو کی اعلیٰ ترین شاعرانہ روایت میر، غالب، انیس کا امین اور اس کو بلند تر منزلوں سے روشناس کرنے والا شاعر ٹھہراتی ہیں۔"(۲۱)

یہی نہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کا سارا کلام ہی صوتی و لفظی اور معنیاتی ہم آہنگی کی خوبصورت مثال پیش کرتا ہے جو ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی خالصتاً شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔ خصوصاً اس سلسلے میں اقبال کی سب ہی مشہور نظموں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن میں صوتی ہم آہنگی اور لفظی مناسبت کا حسین ترین دروبست ملتا ہے۔

مثنے از خروارے کے طور پر مسجد قرطبہ، طلوع اسلام، لینن خدا کے حضور میں، ذوق و شوق اور ساقی نامہ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی تمام ہی نظمیں شاعرانہ صنعتوں کی بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔

اسلوبیاتی مطالعے کی کئی جہتوں میں سے ایک جہت اقبال کی تمثال نگاری بھی ہے۔ اقبال کے ہاں نت نئے استعارے، علامتیں اور تمثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی روایات، قدیم تمثالیں اور تاریخی تلمیحات بھی ان کے شعری ذوق کا اظہار کرتی ہیں۔ اقبال کے ہاں ہیت شعر میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ گو کہ یہ تنوع مختلف موضوعات اور مضامین کے تحت ہے لیکن اس کی جائے کمال وہ مکالماتی قطعات اور مختصر نظمیں ہیں جو فارسی کی صنفِ حکایات کے طرز پر کہی گئی ہیں۔ لیکن بہ اعتبار وسعت یہ فارسی حکایات سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"اقبال کی حکایات کی تمثیلی اور ڈرامائی صورتیں سعدی وغیرہ سے بہت بڑھ گئی ہیں۔ جن کی حکایات تمثیلی کم واقعاتی زیادہ ہیں۔"(۲۲)

گویا اقبال نے نا صرف اپنی تمثالوں میں شاعرانہ مصوری کو رواج دیا ہے بلکہ روایت کی توسیع کا کام بھی انجام دیا ہے۔ اقبال کے ہاں جو تنوع ہیت شعر میں ملتا ہے اس میں قریباً تمام اصناف سخن ملتی ہیں۔ مثلاً مسدس، مخمس، ترکیب بند، قطعہ، رباعی اور مثنوی وغیرہ خصوصاً اقبال کی نظمیہ شکلوں میں مخمس، مثلث اور قطعہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ ان میں جوش اور موسیقیت کا عنصر غالب ہے۔ مثلاً شبنم، سرود انجم، تنہائی، فصل بہار اور نغمہ ساربان حجاز (حدی) وغیرہ۔

اسی طرح اقبال کے ہاں قافیہ پیمائی کے سلسلے میں بھی بڑا تنوع اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔ گو کہ اقبال نے قافیہ پیمائی کو شاعری کا مقصد قرار دیا بلکہ قافیہ وردیف کو بھی دیگر شعری صنعتوں کی طرح فن کے لوازم کے طور پر ہی لیا ہے۔ بنابرایں انھوں نے عام روایت غزل گوئی سے ہٹ کر غیر مردف غزل کو رواج دینے کی کوشش کی ہے۔ مثنوی 'اسرار خودی' کے اشعار کے قوافی پر سید سلیمان ندوی کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے انھیں لکھا کہ:

"قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا۔ یہ بالکل بجا ہے مگر شاعری اس مثنوی سے مقصود نہ تھی۔ اس واسطے میں نے بعض باتوں میں عمداً تساہل برتا۔ اس کے علاوہ مولانا روم کی مثنوی میں قریباً ہر صفحے پر اس قسم کے قوافی کی مثالیں ملتی ہیں۔ اور ظہوری کے 'ساقی نامہ' کے چند اشعار بھی زیر نظر تھے۔ غالباً اور مثنویوں میں بھی ایسی مثالیں ہوں گی۔"(۲۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوافی کے بارے میں اقبال اختیاراتِ شاعرانہ کے قائل تھے اور اپنے لیے اساتذہ کے کلام کو سند قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ اقبال میں ایطاء اور اختلاف حرکت کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

گو کہ محققین اقبالیات اقبال کے اردو و فارسی کلام کو فکر و فن کی ہم آہنگی کے لحاظ سے یکساں قدر و منزلت کا حامل قرار دیتے ہیں۔ البتہ ان کی فارسی شاعری کو فنی تنوع اور جامع و مبسوط فکر کی بنا پر زیادہ اہم تصور کیا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اقبال کی نظر فارسی کی شعری روایات، اسالیب، متنوع فنی خصوصیات اور جمالیاتی کیفیات پر بہت گہری تھی۔ علاوہ ازیں اقبال نے فارسی شاعری میں ہیت اور تکنیک کے بعض نئے تجربے بھی کیے ہیں۔ اور یہ تجربات ان کی فنی و جمالیاتی اور تخلیقی شعور کی روشن دلیل ہیں۔

اقبال نے مثنوی، رباعی اور غزل میں بالترتیب رومی، باباطاہر عریاں اور حافظ کا تتبع کیا ہے۔ اقبال کی بیشتر فارسی شاعری مثنوی کی صنف میں ہے اور ان کی تمام مثنویاں بحر رمل مسدس مخذوف یا مقصود میں ہیں۔ البتہ گلشن راز جدید اسی بحر میں ہے جو محمود شبستری نے اپنی مثنوی کے لیے اختیار کی ہے۔ اقبال نے اپنی مثنویوں میں صوری و معنوی اختراعات، جدتیں اور ابداعات بھی قائم کی ہیں۔ مثال کے طور پر جاوید نامہ، پیام مشرق اور ارمغان حجاز کی شاعری کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح غزل میں اقبال نے حافظ کے اسلوب کو اپنایا ہے۔ خصوصاً پیام مشرق کی غزلیات اپنے انداز شعریت میں حافظ کے انداز غزل گوئی کا پرتو معلوم ہوتی ہیں۔ بنابرایں اقبال نے ان غزلیات کے عنوان کے لیے حافظ ہی کے ایک شعر سے 'مئے باقی' کی ترکیب منتخب کی ہے۔

اقبال کی غزل گوئی کے بارے میں ڈاکٹر عبدالشکور احسن رقم طراز ہیں کہ:

"اقبال کی غزل میں رمزیت و ایمائیت کی وہی کیفیت ہے جو فارسی غزل کی شان ہے۔ البتہ موضوعات کی وسعت اور تنوع نے یہاں رمز و ایماء کے میدان میں مزید وسعت پیدا کی ہے۔ اور شاعر نے "تنگنائے غزل" میں ہر طرح کے نئے فلسفیانہ افکار کے نہایت کامیاب اظہار سے اسے ایک نئی معنویت سے آشنا کیا ہے۔ یہ انداز اگر شاعر کے فن کی پختہ کاری کی دلیل ہے تو صنفِ غزل کی لچک، وسعت اور بے انداز صلاحیتوں کا آئینہ دار بھی ہے۔"(۲۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے غزل گوئی کو بہت وسعت دی ہے اور ہر قسم کے مضامین اس میں سمو دیئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود غزل کی شعریت اور نغمگی میں فرق نہیں آیا اور اس کی موسیقیت اپنی جگہ برقرار رہی ہے۔

رباعیات اقبال جو بیشتر پیام مشرق، ارمغان حجاز اور بال جبرئیل میں شامل ہیں۔ اقبال کے فن رباعی پر مکمل تصرف کی آئینہ دار ہیں۔ عام طور پر رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع مردف و مقفیٰ ہوتا ہے جبکہ تیسرا مصرع آزاد ہوتا ہے۔ لیکن اقبال نے اپنی جدت پسندی اور انفرادیت کا ثبوت دیتے ہوئے اور اپنے شاعرانہ اظہار کمال سے متعدد رباعیات میں پہلا اور تیسرا مصرع بے ردیف و مقفیٰ رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رباعیات میں تسلسل بیان اور وسعت معانی کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ بنابرایں اقبال کا شمار اردو اور فارسی کے عظیم المرتبت رباعی گو شعراء میں کیا جاتا ہے۔ اقبال نے رباعی گوئی میں باباطاہر عریاں جیسے نابغہ روزگار فارسی گو شاعر کا تتبع کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد ریاض:

"اقبال کی یہ دو بیتیاں دراصل ترانے ہیں۔ جن کا وزن باباطاہر عریاں ہمدانی (قرن پنجم ہجری کے شاعر) کی معروف پہلویات یا فہلویات کے وزن کا ہے۔ علامہ نے خود ارشاد کیا ہے کہ انھوں نے باباطاہر عریاں کی دو بیتیوں کا اسلوب اپنایا ہے۔"(۲۵)

فن شعر کے ناقدین نے اقبال کی فارسی شاعری کو مجموعی طور پر سبک اقبال کا نام دیا ہے۔ ان کا یہ سبک اردو و فارسی زبانوں کی شاعری میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے نمایاں ہے۔ اور ان کی شاعری کی تمام اصناف میں ظاہر ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر حسین خطیبی جو ملک الشعرا محمد تقی بہار کے شاگرد خاص اور تہران یونیورسٹی میں سبک شناسی کے استاد تھے۔ اقبال کے منفرد اسلوب شعر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

"اقبال کے سبک شاعری کو 'سبک اقبال' کا نام دینا مناسب ہے۔ اقبال کے ہاں سبک ہندی کے عناصر تقریباً مفقود ہیں۔ انھوں نے منوچہری، ناصر خسرو، سنائی، عطار، رومی، سعدی، حافظ اور جامی ایسے اساتذہ شعراء کے سبک کا بغور مطالعہ کیا اور اپنے اشعار کو انہی کے قدیم سبک پر استوار کیا۔ لیکن نئے مضامین و موضوعات کی بنا پر ان کا سبک 'سبک اقبال' بن گیا ہے۔۔۔۔ فارسی شاعری میں اقبال نے حیرت انگیز مہارت دکھائی اور اساتذہ کے رنگ میں انتہائی فصاحت و بلاغت کے ساتھ دقیق و عمیق، فلسفیانہ، صوفیانہ، اخلاقی اور سائنسی مضامین بیان فرمائے ہیں۔ ان کی شاعری میں لغوی و معنوی دشواریوں یا الفاظ کے بے محل استعمال کی مثالیں بمشکل ملیں گی۔۔۔ معانی کی بلندی کے ساتھ اقبال کے الفاظ بھی بلند ہیں۔ اگرچہ اقبال کا مقصد محض شاعری نہ تھا۔ وہ حقائق بیان کرنے پر زیادہ متوجہ رہے مگر ان کے کلام کو پڑھیں تو فکر و فن ہم سطح و ہم ردیف نظر آتے ہیں۔"(۲۶)

اقبال کے کلام اور مکتوبات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نا صرف اساتذہ کے کلام کا نہایت گہرا مطالعہ کر رکھا تھا بلکہ اکثر غیر اہم اور گمنام شعراء کے کلام کے بارے میں بھی خاطر خواہ معلومات رکھتے تھے۔ بااین ہمہ فارسی زبان کے مزاج سے انھیں گہری واقفیت حاصل تھی۔ فارسی زبان کے الفاظ و محاورات اور ان کی معنوی، نفسیاتی اور لسانی خصوصیات پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ کلاسیکی الفاظ و محاورات کے ساتھ ساتھ جدید تراکیب اور الفاظ و محاورات کو بھی یکساں مہارت سے استعمال کرتے تھے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری فنی لحاظ سے کسی طرح بھی اساتذہ فن کے معیار سے کم نہیں ہے۔ بلکہ کئی ایک لحاظ سے اس کی فنی اہمیت دیگر عظیم المرتبت شعراء کے فن شعر سے بڑھ کر ہے۔ آج جو قدر و منزلت ان کی شاعری کو حاصل ہے، وہ فکر و فن کی اس بے مثال ہم آہنگی کی بدولت ہے جو ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کی فکر کو ابدیت سے ہمکنار کرنے اور جاودانی عطا کرنے میں ان کے فن کا بھی بڑا دخل ہے۔

اقبال نے جو فلسفیانہ اور اخلاقی افکار پیش کیے ہیں۔ وہ اپنی آفاقیت کی بنا پر ہر دور کے فلسفیوں، حکیموں اور شاعروں کا موضوع بحث رہے ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ کسی اور شاعر، حکیم یا فلسفی کو یہ اوجِ کمال حاصل نہ ہوا یا بہت ہی کم تعداد کو یہ ابدیت حاصل ہوئی جو آج اقبال کا نصیب ہے؟ اس کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اس بلند اقبالی کا سبب یہی ہے کہ اقبال نے فکر کو فن میں اس طرح سمو دیا ہے کہ فکر اور فن باہم گھل مل گئے ہیں۔ یہی فکری و فنی ملاپ ان کو ابدیت اور آفاقیت کے لامتناہی عنصر سے ہمکنار کرنے کا باعث ہوا ہے۔

بہار کی نظر میں شیوہ شعر و شاعری:

بہارؔ کا مجموعہ کلام دیوان ملک الشعرا بہار کے عنوان سے دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول قصائد، ترجیع بند، ترکیب بند اور جلد دوم مثنوی، غزل، قطعہ، رباعی اور دیگر اصناف شعر پر مشتمل ہے۔ دیوان بہارؔ نہ فقط مختلف النوع اصناف سخن کے حوالے سے پرمایہ ہے۔ بلکہ موضوعات کے حوالے سے بھی اس میں نہایت رنگا رنگی اور بوقلمونی پائی جاتی ہے۔

قصائد کے اکثر موضوعات دیگر اصناف شعر میں بھی آزمائے گئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر گیتی فلاح رستگار:

"بسیار است مضامینی کہ اندیشہ بہار رابہ خود مشغول داشتہ، زمانی آن را بصورت قصیدہ و بار دیگر آن را بصورت مثنوی یا قطعہ یا غزل یا رباعی بیان داشتہ۔"(۲۷)

ترجمہ: ایسے بہت سے موضوعات ہیں جو بہار نے ایک سے زیادہ بار دہرائے ہیں۔ کبھی قصیدہ اور کبھی مثنوی یا قطعہ اور کبھی غزل یا رباعی میں انھیں بیان کیا ہے۔

لیکن اس تکرار موضوع کے باوجود فنی تنوع کی بدولت بہار کے اشعار میں دلچسپی کا عنصر قائم رہتا ہے۔ اور اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی اور ایک ہی موضوع کا مختلف اصنافِ شعر میں استعمال شاعر کی قادر الکلامی کو ظاہر کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اقبال کی طرح بہار بھی شاعری کو مقصد کے ابلاغ کا ایک مؤثر ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اور لفظ پر معنی کی برتری کے قائل ہیں۔ لیکن شعر کے فنی محاسن اور لوازم شعر کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ خود اپنی شاعری میں بہار نے اس بات کا بہت خیال رکھا ہے کہ ایک بلند خیال موزوں شعر میں ہی ادا کیا جائے۔ اپنے ایک شعر میں اس بات کو یوں کہتے ہیں:

شعر باید سبک سر و دوروان　　　نہ گرانسنگ و مغلق و دشوار(۲۸)

ترجمہ: شعر سبک وروان ہو نہ کہ سنگ سخت کی طرح یا ادق و مشکل ہو۔

اس بارے میں دکتر گیتی فلاح رستگار کہتے ہیں:

"و در عین حال کہ از صفات شعر پر مایہ و ہنری و بار ور برخوردار است، از شور و حال و نکتہ ھای جالب ادبی بی بھرہ نیست۔"(۲۹)

ترجمہ: اور اس کے باوجود کہ ان کا شعر پر مایہ صفات اور کمال ہنر سے مملو ہے، ادبی محاسن اور شعری لطافتوں سے محروم نہیں ہے۔

بہار در حقیقت ایران کے اقبال تھے۔ انھیں شعر جدید اور کلاسیک شاعری میں یکساں کمال حاصل تھا۔ قدما اور اساتذہ کے تتبع میں بہار نے بے شمار اشعار کہے ہیں۔ یہاں تک کہ اساتذہ کے اشعار سے وزن اور اقافیہ تک سے استفادہ کیا ہے لیکن اس سے ان کی شاعری کی انفرادیت میں یا شعری عظمت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ اس کے برعکس ان کی استعداد شعر اور قدرت بیان میں اضافہ ہوا ہے۔ بنابرایں آج ان کے کلام کو اساتذہ کے کلام کا ہم پایہ قرار دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ ایرانی ملک الشعرا بہار کی شعری عظمت کی بنا پر ان کو مولانا عبدالرحمان جامی کے بعد سب سے بڑا اور جامع صفات شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ اور انھیں اس شعری روایت کے تسلسل کی ایک کڑی قرار دیتے ہیں جو جامی جیسے والا صفات شاعر کی ذات پر قریباً قریباً ختم ہو چکی تھی۔

استاد لطف علی صور تگر جو سبک خراسانی کے ایک معروف شاعر اور کلاسیکی ادب کے محقق و استاد تھے۔ بہار کی تعریف میں ان کے ذیل کے شعر کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ کہتے ہیں:

آن خسرو سخن کہ پس از دور شیخ جام
اقلیم شعر را بجز او تاجدار نیست (۳۰)

ترجمہ: شعر و سخن کی سلطنت کا بے تاج بادشاہ مولانا جامی کے بعد بہار کے سوا کوئی نہیں ہے۔

اس سے یہ ہر گز مراد نہیں ہے کہ جامی کے بعد ایران میں فارسی شاعری ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ یا شاعر ناپید ہو گئے تھے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے بعد آنے والے شاعروں کے ہاں وہ کلاسیکی روایت مفقود تھی اور وہ شعری اسلوب ترک کر دیا گیا تھا۔ جس سے فارسی شاعری کی شان و شوکت قائم تھی۔ باایں ہمہ بہار ادبیات فارسی میں تجدد اور اصلاح کے بھی زبردست حامی تھے۔ اور فارسی شعر و ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے کا باعث بھی تھے۔

گو کہ دیگر شعراء کی طرح بہار نے بھی تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا خاص میدان "قصیدہ" ہے۔ بقول عبدالحسین زرین کوب:

"بہار در نظم از پیروان سبک قدیم و پیش از ہمہ، شاعر قصیدہ سرا است۔ و در قصیدہ سرایی مہارت و استادی فوق العادہ از خود بروز می دہد۔"(۳۱)

ترجمہ: بہار نظم میں سبک قدیم کے پیروکاروں اور تمام شعراء میں قصیدہ کے استاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اور قصیدہ گوئی کے فن کو انھوں نے کمال تک پہنچایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف تو بہار قدیم کے والہ و شیفتہ ہیں اور دوسری جانب اپنے عہد کی شعری ضروریات اور جدید تغیرات سے بھی

بے خبر نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کی زبان، لہجہ اور طرز شعرائے قدیم کے تتبع میں ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس امر کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ اپنے عہد کے جدید موضوعات اور عصری مسائل کو شعر قدیم کے قالب میں پیش کریں۔ چنانچہ بہار نے قدیم شعراء کی سبک، آہنگ اور شیوہ میں سیاسی و اجتماعی مباحث کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے لیکن بہار کو کسی خاص سبک اور مستقل طرز کا شاعر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جس قدر جدت پسندی کا ثبوت انھوں نے اپنی شاعری میں دیا ہے۔ وہ ایک طرح کا انحراف ہے۔ گویا انھوں نے موضوع و مفاہیم میں جدت اور ہیت میں کلاسیکیت کو اختیار کیا ہے۔ بقول یحییٰ آرین پور:

"حقیقت این است کہ بہار ہیچ گاہ در شعر صاحب شیوہ خاص و مستقلی نبودہ و سہم وی در باز کردن راہ‌های تازہ و آفریدن مضامین نوین حتیٰ از ایرج کہ ہیچ گونہ تظاہر بہ تجدد خواہی نمی کند، کمتر است۔ او در ہیچیک از مراحل فعالیت ادبی خود عملا قادر نیست پا از دائرہ اصول مسلمہ قدما فراتر نہد۔ وبہ عبارت دیگر چہ در آثار قدیمہ وچہ در اشعار پر شور وطنی واجتماعی خود، ہمیشہ یک شاعر ادیب واستاد قصیدہ سرا است۔"(۳۲)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ بہار نے شعر گوئی کے لیے کوئی خاص اور مستقل اسلوب اختیار نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی فنی اختراعات و ایجادات کی جانب کوئی توجہ دی تھی بلکہ اس سلسلے میں ان کی عدم توجہ ایرج سے بھی کم ہے۔ جس نے اس بارے میں کوئی توجہ سرے سے دی ہی نہیں ہے۔ وہ اپنی ادبی فعالیت پر قدرت مند نہ ہوتے ہوئے قدما کے مسلمہ اصولوں پر اکتفا کرتے ہیں لیکن اس کے بر خلاف قدما کے آثار ہوں یا بہارؔ کے پر جوش ملی اشعار وہ ایک ادیب شاعر اور قصیدہ گوئی کے امام دکھائی دیتے ہیں۔

قصیدہ گوئی میں بہار کو کمال حاصل تھا۔ ان کے قصیدے خوبی و صلابت میں کسی طرح بھی ان کے معاصر قصیدہ گو شاعر ادیب الممالک کے قصیدوں سے کم نہیں تھے۔ بلکہ اس صنفِ شعر میں انھیں اساتذہ کے ہم پایہ قرار دیا جاتا ہے۔ اگر معنی و مفہوم کو ان کے قصائد سے الگ کرتے ہوئے بھی جائزہ لیا جائے تو ان کے قصائد فنی اعتبار سے بھی بے مثال قرار پاتے ہیں۔

بہار کے قصائد شعریت، موسیقیت، شکوہ الفاظ اور جوش و جذبے جیسی شعری صنعتوں سے پر مایہ ہیں۔ انھوں نے روایتی قصیدہ گوئی کا انداز اپنانے کے ساتھ ساتھ جدید عصری موضوعات، سیاسی و فلسفیانہ افکار اور اخلاقی مضامین کو بھی قصیدے کا موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ اس طرح بہار نے روایت اور جدت کا خوبصورت امتزاج اپنے قصائد میں پیش کیا ہے۔ بقول محمد علی ندوشن:

"قصائد او مانند بدن گرم زندہ است و مانند میوہ آبدار و شفاف است۔ کلمات کہنہ و فراموش شدہ در دست او، از نو جان می گیرند و حتی اگر معنای آن‌ها نیز بر خواننده مفہوم نگردد، ہمان نوازش موسیقی و خروش درونی شعر، بہ تنہایی او را می ربایند۔"(۳۳)

ترجمہ: ان کے قصائد ایک پر حرارت وجود کی مانند زندگی سے بھرپور ہیں۔ اور آب دار میوے کی مانند رس دار اور شفاف ہیں۔ ان کے ہنر کا کمال یہ ہے کہ متروک اور قدیم الفاظ و تراکیب بھی ان کے ہاتھوں از سر نو زندہ و جاوید ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر ان کے معنی و مفہوم سے صرف نظر بھی کریں تو بھی اس کی شعریت و موسیقیت اپنی جانب متوجہ کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

بہار کی شعری حیثیت کا ایک حوالہ ان کی سبک شناسی کی وجہ سے بھی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جو فارسی ادبیات کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار کی حیثیت سے موجود رہے گا۔ فارسی ادبیات میں آج بھی سبک‌های خراسانی، عراقی، ہندی اور دورہ بازگشت کا ذکر موجود ہے۔ اس کا سہرا بہار کی دقتِ نظر اور جدت طبع کو جاتا ہے۔ اور وہ تمام کاوشیں جو سبک شناسی کے ضمن میں آج تک ہوئی ہیں۔ وہ محض ان باتوں کی تکرار اور نشاندہی پر مشتمل

ہیں۔ جو اصل میں بہار کی تحقیق و تدقیق کا حاصل ہیں۔ سبک شناسی کے موضوع پر سب سے پہلے بہار نے تحقیق کی اور تین جلدوں پر مشتمل کتاب لکھی۔ جس میں کلاسیکی شاعری سے لے کر معاصر شاعری تک تمام اصناف شعر، خصوصاً مختلف سبکوں کے بارے میں ایک پر مغز تحقیق پیش کی۔ اس سے بہار کی سخن دانی اور شعری عظمت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

بہار نے اپنی شاعری کے لیے کسی خاص سبک کو مخصوص نہیں کیا تھا لیکن ان کی شاعری میں سبک خراسانی کا رنگ زیادہ جھلکتا ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب:

> "این قید ھیچ گاہ موجب نمی شود کہ در ہر حال زبان شعری خود را محدود بہ ھمان مفردات و تعبیرات سبک قدیم نگاہ دارد، جز در مواردی کہ نظرش تتبع کامل و طبع آزمایی در آن سبک باشد۔ و در این صورت درست مانند آن است کہ یکی از بزرگترین شعرای قرن چہارم و پنجم ہجری با ہمان فصاحت شعر بگوید و ہنر نمایی کند۔۔۔ در عین رعایت اسلوب قدیم از جنبہ لفظی در ابداع معانی و ابتکار مضامین و ایجاد تشبیہات نو و استعارات و کنایات بدیع در عصر خود بی ہمتاست۔"(۳۴)

ترجمہ: یہ پابندی کبھی بھی اس بات کا باعث نہیں بنتی کہ ہر حال میں وہ سبک قدیم کی مفردات و ترکیبات کی اپنے شعر میں پابندی کریں۔ سوائے چند مقامات کے کہ جن میں ان کے خیال میں مکمل تتبع اور طبع آزمائی کی جاسکتی ہے۔ اور یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ قرن چہارم و پنجم کا کوئی استاد فن شعر کہتا ہے۔۔۔ اسلوب قدیم کی اس پابندی کے باوجود الفاظ کا چناؤ، معانی کی ندرت اور موضوعاتِ نادر اور نت نئی تشبیہات و استعارات اور عجیب و غریب کنایات کے استعمال میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

بہار کے بارے میں بلاشک و تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ قدما و اساتذہ کے تتبع کے طور پر بہار کے ہاں انہی کا سا انداز جستجو اور فکر کی اڑان اور تخیل کی بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے کلام خصوصاً قصائد شکوہ الفاظ اور پر زور بیان کے درمیان جابجا سادہ عام فہم الفاظ کا نمونہ بھی پیش کرتا ہے۔ جو قدیم تعبیرات و ترکیبات شعری میں سمو کر سبک عراقی اور خراسانی کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ جو تجدد اور تنوع کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ بقول عبدالحسین زرین کوب:

> "باری آثار تجدد و تنوع در اکثر اشعار اخیر او در لفظ و معنی، آشکار است، و با این تعبیر، بہار را می توان از پیشتر وان تجدد ادبی امروز ایران خواند۔"(۳۵)

ترجمہ: بلکہ ان کے آخری اشعار میں اکثر ایسے ہیں جن میں لفظ و معنی کی جدت اور تنوع ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہار کو عصر حاضر کے تجدد پسند شعرا کا پیشرو تسلیم کیا جاتا ہے۔

بہار کا شمار ان خاص الخاص معدودے چند شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے غزل گوئی کو مورد توجہ نہیں گردانا۔ جب کہ غزل فارسی ادبیات کی مرغوب ترین اور رائج ترین صنف سخن شمار ہوتی ہے۔ اور حملہ مغول کے بعد سبک عراقی اور سبک ہندی کی بیشتر شاعری صنف غزل میں موجود ہے۔ ناصرف یہ بلکہ خود بہار کے زمانے میں بھی غزل کو شاعری کے تاج کی سی حیثیت حاصل تھی۔ اور فارسی گو شعراء کی محبوب ترین صنف کی حیثیت سے غزل میں نہ صرف روایتی مضامین کہے جاتے ہیں بلکہ معاصرین نے اس صنف شعر میں عاشقانہ، فلسفیانہ، عارفانہ حتیٰ کہ سیاسی موضوعات کے اشعار کہنے بھی شروع کر دیئے تھے۔ لیکن غزل کی مقبولیت کے اس دور میں بہار نے غزل سرائی کی بجائے قصیدہ گوئی کو اپنا مورد توجہ قرار دیا اور اسی میدانِ ہنر میں کمال حاصل کیا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بہار اپنے ابتدائے شاعری کے دور سے ہی 'آستان قدس رضوی' کے ملک الشعرا مقرر ہو گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے شاعری کی ابتدا میں ہی اپنے والد کی طرح قصیدہ گوئی شروع کر دی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے اپنے سیاسی و اجتماعی افکار کے ابلاغ کے لیے قصیدہ کو غزل سے زیادہ مؤثر پایا ہو گا۔ اور یہ ان کا فطری رجحان طبع بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جو شکوہ کمال ان کے قصائد میں ملتا ہے وہ ان کی غزلیات میں مفقود ہے۔ بنابرایں عبدالحسین زرین کوب، بہار کے لیے 'شاعر قصیدہ سرا' کا خطاب تجویز کرتے ہیں۔

"بہار شاعر عشق و غزل نیست، شاعر قصیدہ و حماسہ است۔"(۳۶)

ترجمہ: بہار عشق و غزل کا شاعر نہیں ہے بلکہ قصائد اور رزمیہ شاعری کرنے والا شاعر ہے۔

گو کہ بہار نے غزل کو مورد توجہ قرار نہیں دیا اور اس ضمن میں ان کی فنی کاوش بہت کم ملتی ہے۔ لیکن دیگر اصناف سخن ان کے فنی کمال کو بدرجہ اتم ظاہر کرتی ہیں۔ خصوصاً قطعات، رباعیات اور مثنوی میں وہی کمال ہنر اپنے اوج پر نظر آتا ہے جو ان کے قصائد کا خاصہ ہے۔

کلام بہار کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کی طرح بہار نے بھی مقصدیت کے دباؤ سے اپنی شعریت کو دبنے نہیں دیا۔ شعر بہار نہایت مؤثر، خوبصورت اور دلنشین ہے۔ اور اس قدر آسان فہم کہ تحلیل و تفسیر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بہار نے نہایت دلچسپ و دلپسند موضوعات اور عمدہ مضامین کو سادہ متناسب لغات و اصطلاحات، ترکیبات و امثال اور کنایات و تمثیلات میں پیش کیا ہے۔ جو ان کے اشعار کے فنی محاسن کا منہ ملتا ثبوت ہے۔ اور پڑھنے والوں کے ذوقِ سخن اور صمیمیت طبع کو مہمیز کرنے کا باعث ہے۔ بہار نے فن شعر کو زندگی سے ہم آہنگ کر کے گویا شعر و شاعری کے میدان میں ایک تحول و تغیر ایجاد کیا ہے۔

مشترک نکات:

اقبال اور بہارؔ کے کلام میں:

۱۔ شعر و ہنر مقصد کے ابلاغ کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

۲۔ فکر و فن کی ہم آہنگی سے ہی ایک بلند فکر اور ایک فنی شاہکار ابدیت و ہمہ گیریت کے عنصر سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

۳۔ روایت اور جدت کے امتزاج کو قائم کرتے ہوئے ایک مؤثر فن پارہ یا شعر تخلیق کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ صوتی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ تمثیلی و ڈرامائی انداز ملتا ہے۔

۵۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔

۶۔ ہیت اور تکنیک کے نئے تجربے کیے گئے ہیں جو قابل تقلید ہو سکتے ہیں۔

۷۔ مقصدیت کے باوجود شعریت اور فنی محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں۔

حواشی

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، ص:۴۶

۲۔ ارسطو سے ایلیٹ تک، ص:۵۶

۳۔ ایضاً، ص:۴۷

۴۔ ایضاً، ص:۵۷

۵۔ گوئٹے، فاؤسٹ، مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین (لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۴ء) ص:۱۷

۶۔ ارسطو، بوطیقا، مترجم عزیز احمد، ص:۱۴

۷۔ ارسطو سے ایلیٹ تک، ص:۵

۸۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصناف اردو (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء) ص:۱۴

۹۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، شذرات فکر اقبال، ص:۱۵۰

۱۰۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، ص:۶۰

۱۱۔ اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص:۱۱

۱۲۔ ایضاً، ص:۴۴۷

۱۳۔ محمد اقبال، علامہ، اقبال نامہ، مرتبہ، شیخ عطاء اللہ (لاہور: شیخ محمد اشرف، طبع اول، ج:۱) ص:۱۹۸

۱۴۔ محمد اقبال، علامہ، اقبال نامہ، مرتبہ، شیخ عطاء اللہ (لاہور: شیخ محمد اشرف، طبع اول، ج:۲) ص:۲۵۴

۱۵۔ اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص:۶

۱۶۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، ص:۳۴۳

۱۷۔ رومی، جلال الدین، مثنوی معنوی رومی (تہران: چاپ تابش، چاپ اول، ۱۳۶۶ش) دفتر چہار، ص:۸۱

۱۸۔ غالب، مرزا اسد اللہ خان، دیوانِ غالب، مرتب ڈاکٹر سید معین الرحمان (لاہور: گنج شکر پریس، ۲۰۰۱ء) ص:۲۱۷

۱۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، علامہ اقبال، حیات اور فکر و فن (۱۰۱ مقالات) (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء) ص:۶۳۶

۲۰۔ ایضاً، ص:۶۷۰

۲۱۔ ایضاً، ص:۶۸۸

۲۲۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، مقالات اقبال (لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۴ء) ص:۱۱۰

۲۳۔ محمد اقبال، علامہ، اقبال نامہ، ج:۱، ص:۸۵

۲۴۔ عبد الشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۷۷ء) ص:۸۹

۲۵۔ محمد ریاض، ڈاکٹر، اقبال اور فارسی شعرا (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۷۷ء) ص:۲۴۲

۲۶۔ ایضاً، ص:۳۲

۲۷۔ گیتی فلاح رستگار، منتخب شعر بہار وبررسی کوتاھی از اشعار او(مشہد مقدس، چاپ خانہ طوس، ۱۳۵۱ش)ص:۱۶

۲۸۔ بہار، محمد تقی، دیوان اشعار، ج:۱، ص:۲۳۶

۲۹۔ گیتی فلاح رستگار، منتخب شعر بہار وبررسی کوتاھی از اشعار او، ص:۱۷

۳۰۔ خواجہ عبدالحمید عرفانی، ڈاکٹر، اقبال ایران، ص:۱۳۴

۳۱۔ عبدالحسین زرین کوب، دکتر، باکاروان حلہ (تہران: ابن سینا، ۱۳۴۴)ص:۳۳۸

۳۲۔ آرین پور، یحییٰ، ازصباتانیما(تہران: انتشاراتِ امیر کبیر ۱۳۵۰ش، ج:۱)ص:۳۳۹

۳۳۔ ندوشن، محمد علی اسلامی، ملک الشعرا بہار، پیام نوین (تہران: تیز، ۱۳۰۴)سال ۳، ش ۱۰، ص:۸

۳۴۔ عبدالحسین زرین کوب، دکتر، باکاروان حلہ، ص:۳۱۵

۳۵۔ ایضاً، ص:۳۱۴

۳۶۔ ایضاً، ص:۳۱۵